"اللہ بھئی تم کہاں تھیں رشو؟" ڈمپل نے لمبے لمبے ناخنوں کو لہرا کر پوچھا۔

"نکلی تو تمہارے ہی ساتھ تھی۔ آگے خدا جانے کہاں غائب ہو گئی۔" طیبہ بولی

"اچھا بھئی تم بتاؤ رشو سائیکلوجی ڈیپارٹمنٹ کا سب سے اچھا لڑکا کونسا ہے؟"

طیبے کا دایاں بایاں کھی کھی بجنے لگا۔ رشیدہ کو اپنے ہاتھ ٹھنڈے پڑتے محسوس ہوئے۔

"زیادہ ووٹیں غازی کی ہیں۔" طیبہ نے جواب دیا۔

"غازی؟ کونسا غازی؟" رشو نے جی میں سوچا۔

"مجھے تو کسی کا نام نہیں آتا۔"

"بھئی سب سے پرامی ننٹ گروپ ہی غازی کا ہے۔ مظفر ہے، افتخار ہے۔ غازی ہے رشید ہے۔ کبھی کبھی عباس اور ذوالفقار بھی ان کے گروپ میں مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ دونوں دراصل ٹریٹر ہیں۔ ہیں ناں طیبہ۔۔۔"

"بتاؤ ناں کون سب سے اچھا ہے، یہ سابدہ اور راحت تو بالکل گھنی ہیں۔ بس کھی کھی ہنستی جاتی ہیں۔"

رشیدہ کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ میں جے مالا پکڑا کر کہا ہو جا اپنے من مندر کے پجاری کو ڈھونڈ لے۔

مہا بھارت کے بن پرب میں لکھا ہے کہ جب دمینتی نور کے سانچے میں ڈھلی راجوں مہاراجوں کو غلط انداز سے دیکھتی ہاتھ میں ور لئے سوئمبر میں آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ اندر، اگنی، ورن اور یم چاروں نل کے ہم شکل بنے بیٹھے ہیں، اپنی محرومئ قسمت پر ہراساں

دکھ ہوا۔ سوچنے لگی کہ اب راجہ نل کے گلے میں جے مالا کیسے ڈالوں گی۔ یہاں تو پانچ راجہ ہم شکل بیٹھے ہیں۔ پھر بہت سوچا کی۔ کبھی آگے نکل جاتی کبھی پیچھے کو ہٹ جاتی۔ مستک پر پسینے کے قطرے اکٹھے ہونے لگے۔ ہاتھوں میں جے مالا کانپنے لگی۔ آخر خیال آیا کہ پنڈت کہتے ہیں کہ دیوتاؤں کا سایہ نہیں ہوتا۔ وہ پلک نہیں جھپکتے۔ اور ان کے پاؤں کبھی دھرتی کو نہیں چھوتے۔ اب جو غور سے دیکھا تو اندر اگنی جمراج اور برن میں یہی باتیں پائیں۔ جنھیں پنڈتوں اور وودوانوں نے انتر سمجھایا تھا۔ بے خوفی سے آگے بڑھی۔ دیوتاؤں کو پرنام کیا اور ور مالا کو مہاراجہ نل کے گلے میں ڈال دیا۔۔۔

رشو جانے کو تو کسی بڑی ماں نے راجہ نل شناخت کرنے کا طریقہ نہ بتایا تھا۔ ہاں نانی کے ڈبے میں ایک خط ضرور تھا۔ اور خالی ان کے ریزولیوشن پر دستخط کروانے اور کرنے کے چند لمحے تھے۔ لیکن یہ ایسی کمزور نشانیاں تھیں کہ وہ گھبرا گئی۔

”اللہ یہ بھی گھنی ہے ساجدہ اور راحت کی طرح۔۔۔ اچھا یہ بول غازی اچھا ہے کہ ظفر کہ افتخار۔۔۔“

”مجھے کیا پتہ۔۔۔“ وہ زچ ہو کر بولی۔

”اچھا یہ تو پتہ ہے ناں کہ آج میری سالگرہ ہے اور تمہیں آنا ہے میری سالگرہ پر پورے چار بجے۔۔“ طیبہ نے سوال کیا

”میں نے ابھی خالہ جان سے نہیں پوچھا“ رشو نے جواب دیا۔

”ہفتہ ہوا تمہیں دعوت نامہ بھیجا تھا۔ ابھی تک اجازت نہیں لی۔ نہیں لی تو لے لینا

اجازت . . .“ راحت بولی۔

”بھبھی رشتو سب ساڑھی پہن کر آ رہی ہیں۔ تم بھی پلیز ساڑھی پہننا . . .“

”ساڑھی؟ . . . میں نے کبھی ساڑھی نہیں پہنی۔“ وہ آہستہ آہستہ اعتراف کرتے ہوئے بولی۔

”تمہارے لئے ساڑھی میں لاؤں گی . . . اچھا؟“ ڈمپل بولی۔

”سب وہیں تیار ہوں گی۔ خوب مزہ رہے گا۔ زاہدہ کہاں ہے اس وقت؟“

”لائبریری میں ہوگی۔ اس کے ذہن پر تو فرسٹ آنے کا خبط سوار ہے . .“

خالہ فیروزہ سے اجازت لئے بغیر جب رشیدہ راجگڑھ روڈ پہنچی تو اسے معلوم نہ تھا کہ یہ شام اس کے لئے اتنی یادگار ہو گی۔ طیبہ کے والد ریٹائرڈ سول سرجن راجگڑھ میں اس جگہ رہتے تھے جہاں سے چوبرجی کے تینوں مینارے صاف نظر آتے ہیں۔ سامنے ریواز گارڈنز کی وہ کوٹھیاں تھیں جنہیں آہستہ آہستہ مسمار کیا جا رہا تھا۔ یہ کوٹھیاں مسکونہ صاحبان عالی شان کی اتنی پرانی تھیں اور اتنے سیلاب دیکھ چکی تھیں کہ ان میں بسنے والے والا اعتبار جنیش گیجو قسم کے اعلیٰ حضرت افسران کو ان کوٹھیوں کو منہدم کرنے میں ہی عافیت نظر آئی جو چھتیں ان عمارتوں کی کھپریل سے بنی تھیں۔ سامنے محرابی برآمدے اور غسل خانوں میں کموڈ تھے۔

اس علاقے سے آگے بڑھ کر جنوب رویہ سڑک پر جہاں سے ایک سڑک بہاولپور روڈ کو کہ ایک زمانے میں جہاں کوٹھی کمشنر بہادر کی ہوا کرتی تھی، ایک سڑک نواں کوٹ

کی جانب۔ ایک راستہ کو سڑک جس کی عموماً شکست و ریخت کی عادی تھی حسن آباد کو،
ایک کلاں سڑک جو آگے چل کر خاصی کشادہ تھی۔ چاہ پھواڑے کو نکلتی تھی۔ اس جگہ جہاں
سڑکوں کے راستے ڈانڈے ملتے تھے۔ اب صرف تین مینار کی چوبرجی کھڑی ہے۔

"یہ باغ پربہار کرزاں کوٹ سے لے کر تا مغرب رویہ لاہور بکنارہ
دریائے راوی تیار ہوا تھا۔ موسم برشگال اور دریائے راوی کے صدمے سے مسمار ہو
گیا۔۔"

حال اس عمارت کا یوں بیان کرتے ہیں کہ عالمگیر کی چہیتی بیٹی زیب النساءؔ
تخلص جس کا مخفی تھا۔ اور جو صاحب دیوان ہونے کے ساتھ ساتھ حسن و خوبی میں یکتا تھی۔
چوبرجی کو اسی شہزادی نے معرفت حیا بائی دایہ خود تعمیر کرایا تھا۔ حیا بائی نے کہ خواص بہت
قابلہ، منظور نظر محرم راز زیب النساء تھی۔ بڑی محنت اور لگن سے یہ باغ اپنی نگرانی
میں مکمل کروایا۔ اسی لیے اس جگہ کا نام باغ حیا دایہ مشہور ہوا۔ جب ایک روز
زیب النساء یہ باغ دیکھنے چلی تو راستے میں سنا کہ چند اشخاص آپس میں اس باغ کو
میا بائی کا باغ کہہ رہے ہیں۔ دل رنجیدہ ہوا کہ جس باغ کے توسط سے ناموری حاصل
کرنے کی آرزو تھی سو پہلے ہی کسی کے نام زد ہو چکا ہے۔ اب یہی مناسب سمجھ کر
جو کوئی در باغ پر مجھ کو دعائے عافیت دے باغ اسی کو عطا کر دوں۔ جب شہزادی
چوبرجی کے دروازۂ کلاں پر پہنچی تو اتفاقاً میا بائی نے کورنش بجا کر دعائے عافیت
دی۔ شہزادی عالی وقار نے باغ مذکورہ میا بائی کو عطا کیا اور باغ دیکھے بغیر قلعے

کو اس راہ سے روانہ ہو گئیں جہاں پہلے افسروں والی شان کی کوٹھیاں تھیں۔

کئی حکایاتِ عاشقانہ عاقل خان اور زیب النسا کی مشہور ہیں۔ لیکن اسی باغ کی تیاری سے متعلق ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ باغ کی روش کی چنائی ہو رہی تھی۔ شہزادی شہ نشین میں بیٹھی اپنی ایک ہمجولی کے ساتھ چوسر کا شغل کر رہی تھی۔ شہ نشینِ ثانی میں پاڑ بندھے تھے۔ استرکاری ہو رہی تھی۔ مزدور آ جا رہے تھے۔ عاقل خان بھی طالبِ دیدار ہوا اور مزدوروں کے زمرے میں شامل ہو کر سر پر تغاری چڑھنے کی دھرت شہ نشینِ ثانی تک گیا۔۔

مزدوروں کا دستور ہے کہ معمار کے آگے تغاری ڈالتے وقت ایسے جملے کہتے ہیں۔

”لے گارا لے با چونا لے“ ۔ ۔ ۔

عاقل خان نے بھی بایں تمنا کہ زیب النساء میرے حال سے باخبر ہو یہ شعر پڑھا۔

من در طلبت گرد جہاں می گردم
گیر۔ ۔ ۔ استاد آہک !

”چوسر بازوں کا بھی معمول ہے کہ کوڑی پھینکتے وقت پانسہ مطلوبہ کا نام لیتے ہیں۔“

زیب النساء جو کہ ضبط و ذکاوت کی تپلی تھی فوراً بولی

گر بادشوی بجز زلفم نرسی
شش پنج دو دو یک !

کہتے ہیں کہ یہی عاقل خان سوختہ جاں شہزادی عالی وقار کی ناموس

پر مرشا۔ ایک روز بہانہ ملاقات کا یہ سوچا کہ تمام اشخاص سرکاری درباری کی ضیافت کی۔ بعد طعام شاہانہ عالمگیر کی خدمت میں امّیدوار ہو کر عرض کی ماحضر کو محل سرائے سلطانی میں بھی پہنچانے کی اجازت مرحمت فرمائی جاوے۔

جب دیگیں پراز طعام ہائے لذیذہ روانہ ہوئیں تو خود بھی ایک دیگ میں دیدار کا دلدادہ پوشیدہ ہو بیٹھا۔ کسی بد فطرت غمّاز نے مخبری کی۔ بادشاہ سلامت بنفس نفیس محلسرا میں آئے۔ ایک دیگ سے کچھ طعام نکال کر چکھا۔ اور فرمایا کہ دیگیں ابھی خام ہیں اس وقت تک آگ پر رکھو جب تک پختہ نہ ہو جائیں۔

شہزادی فرخندہ رو بن آگ کی لپک پر لوٹ کباب ہوئی۔ وہ ماہی بے آب ان کی ناموس پر قربان ہوا۔ جل کر راکھ ہوا۔ لیکن ایک بار بھی لب نہ کھولے۔ محبت کا پختہ زخم سینے میں لئے اگلے جہاں کو کوچ کیا۔ شہزادی زیب النسا خاموش رہی۔ اسکے اندر جو کچھ چل چکا تھا اس کی کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بہت عرصہ بعد ایک دن اس نے شالامار میں میانہ محل میں بیٹھ کر کہا:

اے آبشار نوحہ گر از بہر چیستی ؟
چیں بر جبیں فگندہ ز اندوہ کیستی ؟
آیا چہ درد بود کہ چوں من تمام شب
سر را بسنگ می زدی و می گریستی ؟

جب ڈمپل رشو کے پیش کورٹ میں ساڑھی کی سلوٹیں جھاڑ رہی تھی تو رشو کے جی

میں آئی کہ ڈمپل کو ظفر کے متعلق بتا دے لیکن پھر دل میں سوچا کہ کسی کے کان میں کہی بات کبھی اسی کان تک نہیں رہتی۔ رسوائی کا پہلا زینہ کم ہمتی اور بے صبری کی دلیل ہے۔ اگر انسان کسی کو رازدار نہ بنائے تو افشائے رازِ محبت کا خوف نہیں رہتا۔ یہ عاقل خان کی طرح دیگ کے اندر ہی اندر کوئلہ بنتی ہے، راکھ بنتی ہے۔ اور پھر اس سے ققنس کا پرندہ جنم لیتا ہے۔ اور اس کے دیپک راگ سے آگ لگتی ہے۔ چاروں طرف... محبت کی آگ ... لال پیلے نیلے شعلے، اور اس نئی آگ میں کئی عاقل خان جل مرنے کے لئے اترتے ہیں۔ کوئلہ اور راکھ ہونے کو آگے بڑھتے ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ عاقل خان سے ققنس تک اور ققنس سے عاقل خان تک محبت کا سلسلہ... رازداری کا طریقۂ بیعت!

ڈمپل نے رشو کی پلکوں کو مسکارا سے گریٹا گاربو کی پلکوں میں بدل دیا۔ آج پہلی بار رشو کو محسوس ہو رہا تھا کہ پلکوں کا بپوٹوں پر بہت بوجھ ہے۔ اور پلکیں جب گالوں کو چھوتی ہیں تو ہلکی سی گدگدی ہوتی ہے۔ آب رواں جیسی آتشی گلابی ساڑھی اور بغلوں میں پھنسا ہوا بلاؤز، سر پر ملکہ نفرتیتی کی طرح چڑھے ہوئے بال اور گالوں پر نامعلوم غازہ! رشو کو رشیدہ جہاں بنانے میں ڈمپل کو پورے چار گھنٹے لگے تھے۔ اب وہ ولایتی مینا کن کی طرح پالش شدہ اور آرائشی چیز لگ رہی تھی۔ لمبے کان کھلے ہوئے بالوں تلے چھپ گئے تھے۔ کئی بار رشیدہ نے ناولوں میں پڑھا تھا کہ دیہاتی لڑکیاں کپڑے بدلتے ہی پوری شہرن بن جاتی ہیں۔ ایسے کئی واقعے اس نے فلموں میں بھی دیکھے

تھے۔ لیکن خود اس کے وجود میں ایسی کایا پلٹ آجائے گی۔ اس کا اسے وہم وگمان بھی نہ تھا۔ چلنے میں اس کی جوتیوں کی کھٹکھاہٹ، چاتے پیتے ہوئے قدآدم شیشوں میں ٹھہرا ہوا آتشی گلابی بگولہ، آواز میں ایک شرابی سی کھنک، قہقہوں میں مندر کی گھنٹیوں جیسا بلاوا، . . . رشو کے دل میں پہلی بار یہ تمنا جاگی کہ کاش اس طرح ڈمپل کی ساڑھی میں کوئی اسے دیکھ لے!

راجہ نل تم کہاں ہو؟

تمہاری کونسی نشانی ہے کہ میں تمہیں پہچان لوں؟

جب وہ راحت کی کار میں ڈمپل کی ساڑھی پہن کر گھر پہنچی تو گھر پر کوئی بھی موجود نہ تھا۔ سارے فلم دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ . . وہ اپنے کمرے میں جا کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ چھوٹے سے کنڈے والے آئینے میں اس نے اپنی شکل دیکھی۔ ساڑھی کی سلوٹیں درست کیں۔ دُکھ سے اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بڑی دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی، پھر اس نے کمرے کی کنڈی چڑھائی۔ لٹھے کی شلواروں تلے اور اخبار کے کاغذ پر ٹانیوں کا ڈبہ سپیرے کی ٹوکری بنا بیٹھا تھا۔ اس نے ڈبہ کھولا، اور خط نکال کر ہاتھوں میں لے لیا۔ . . اسے یوں محسوس ہوا جیسے خط کے ہر حرف میں ظفر کی آنکھیں لگی ہیں اور وہ اسے حیرانی سے تک رہا ہے۔ سورج مکھی کی طرح آنکھیں جمائے ایک ہی طرف کو تکے جا رہا ہے۔ اس آنکھ میں لاماؤں کے دیس کی تیسری آنکھ جیسی بصیرت تھی۔ اس نظر میں برمے کی طرح چھید ڈالنے کی قوت تھی۔

اس نے خط کو جلدی سے ڈبے میں بند کر دیا اور کپڑے تبدیل کئے بغیر اسی طرح لیٹ گئی

خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ جے مالا لئے کالج میں پھر رہی ہے... لانوں پر، کلاس رومز میں، گیلری میں ہر طرف نل روپی لڑکے کھڑے ہیں۔ اور وہ نہیں جانتی کہ ان میں سے اصلی راجہ کونسا ہے...؟

دوسرا دور

ٹائیوں کا ڈبہ نیلے سفید خطوں سے بھر
خالہ فیروزہ کو ان خطوں کی آمد و رفت
وہ بھی رشیدہ کے وجود سے تھک چکی تھیں۔ سٹو
تھی وہاں ان کا ارادہ تھا کہ وہ ایسا سامان رکھ
ٹیپ ریکارڈر، اور خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل
کو سٹور میں رکھنے سے ان کی دَب مرنے کا اند
بھی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آئی تھی۔

خالو جمال نے اخبار پر سے نظریں اٹھا کر
"اب تو لڑکیوں کے ہوسٹل دھڑا دھڑ

چکا تھا۔

کے متعلق تو کچھ علم نہ تھا۔ لیکن اب تک

کے ساتھ والے کمرے میں جہاں رشو تھی

میں جو تنویر کی شادی میں کام آسکے۔ فریج،

اور تپائیاں وہ جمع کر چکی تھیں۔ ان چیزوں

شہ تھا۔ لیکن رشو جان کو جواب دینے کی

کہا۔

رہے ہیں۔ یہ آج ایک نیو ماڈرن ہوٹل

کا اشتہار آیا ہے۔ لکھا ہے۔

"گلبرگ میں نیو ماڈرن ہوسٹل کا قیام۔ ڈور میٹریز اور علیحدہ کمروں کا انتظام، استری اور ہیٹر استعمال کرنے کے لئے رعایتیں، طالبات کے لئے کامن روم، مہمانوں کے لئے کھانا منگوانے کا حاضری سسٹم، بسوں کا اڈہ قریب، معقول کرایہ، چونکہ کمرے محدود ہیں اس لئے جلد اپنی درخواست بھیجیے۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔" خالہ فیروزہ نے کہا۔

"کیا کہتی ہیں آپ؟"

"رشو کے لئے درخواست بھیج دیجئے۔"

"رشو کے لئے؟ وہ کیوں۔۔؟"

"بھئی اسی کا بھلا ہوگا۔ اس گھر کا ماحول پڑھنے کے لئے تو سازگار ہے نہیں۔۔۔ بیچاری کو بڑی مشکل پیش آتی ہے پڑھنے میں۔ فضہ ایر کی اور بات تھی۔ اب سکستھ ایر میں تو اسے خاموشی کی ضرورت ہے۔"

"کیوں تنویر یہاں نہیں پڑھتی کیا؟" خالو نے سوال کیا۔

"تنویر کی اور بات ہے۔ ابھی سیکنڈ ایر میں ہے۔ رشو کا تو فائنل ایر ہے۔"

"نامناسب لگتا ہے اس طرح بھیجنا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔"

"خیر کچھ ایسا نامناسب بھی نہیں۔۔۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ تھوڑی لیا ہے لڑکی کو ایم اے کروانے کا۔۔"

خالو جمال کا ضمیر بڑا الجھا اور نرم تھا۔ اس پر ابھی کچھوے کا کھپر نہ چڑھا تھا۔ "ایک سال کی کونسی بات ہے۔ بیچاری بیوہ کی بچی ہے۔ خواہ مخواہ ہوسٹلوں میں بھیجنا ٹھیک نہیں۔"

خالو جمال تک تو اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ رشیدہ یہیں رہے گی لیکن خالہ فیروزہ کے دل میں پس گھلنے لگی۔ آنکھوں میں ہلکی سی مروّت تھی ورنہ وہ لوٹک رشو جان کو جواب دے دیتیں۔ البتہ اب وہ بہانے کی تلاش میں رہنے لگیں۔ اور اس بہانے کو تلاش کرتے انہیں کچھ ایسی دیر بھی نہ لگی۔

خالہ کا چھوٹا سا کنبہ تھا۔ لیکن امورِ خانہ داری بڑے وسیع و عریض قسم کے تھے۔ باورچیخانے کے کام، تنویر باجی کے چھوٹے موٹے امور، اور کپڑے دھونے کی ذمے داری الوری کی، اندر باہر کی صفائیاں۔ بھینسوں کی دیکھ ریکھ، مرغیوں کی غور و پرداخت کے لئے رمضان۔ چھ کنال کی کوٹھی میں قلمی اور تخمی آم کے بوٹے، ننھے گنو اور رایپی کے پیڑ اگانے، لان بھاڑنے۔ وقت پر ٹیوب لگا کر پانی سے کیاریاں سینچنے اور نلائی بیجائی کے لئے غفور مالی۔

ان تینوں کے علاوہ غلام رسول کے ذمے متفرق کام تھے۔

ہر تین ماہ کے بعد خالو جمال کی کار کا ٹوکن بنوانا۔ بجلی کا بل، ٹیلی فون کا بل، منی آرڈر کرانا، لفافوں پر ٹکٹیں لگانا۔ راشن خریدنا، بنک میں روپیہ جمع کروانا اور نکلوانا، وعوتی کارڈوں کی وصولی، اور چپڑاسی کی ڈاک بک میں دستخط کرنا، اپنے

گھر کے دھوتی رقعوں کو نمبر اور کوٹھی کے پتہ کے مطابق پہنچانا، کوئلہ اور چاول کے پرمٹ حاصل کرنا، ہاؤس ٹیکس ادا کرنا۔ مال کی دوکان کا کرایہ وصول کرنا اور کرایہ داروں سے نپٹنا، اور پھر ریاض میاں کی مخبری کرنا غلام رسول کی ڈیوٹیوں میں شامل تھا،

اِن کاموں کے علاوہ مہینے کے شروع میں اکبری منڈی کا چکر بھی اسی کی ذمہ داری تھا۔ بڑے بڑے زین کے تھیلے اور بوریاں لے کر وہ منڈی پہنچتا۔ دالوں کی بیچ سیریاں، تھوک کے بھاؤ، صابن، چینی، گرم مسالہ اور ہندوستان کی ہلدی لمبی سرخ مرچیں، بادام، روح کیوڑہ، سوتیوں کے بنڈل، انار دانہ اور املی سب سودا سلف اکبری منڈی سے ہی آتا تھا۔ اکبری منڈی کے سودا سلف کا یہ بھی آرام تھا کہ غلام رسول اپنے گھر کا سودا بھی بیگم صاحبہ کے حساب میں سے خرید لیتا تھا۔ اس کا علم نہ تو بیگم صاحبہ کو ہوتا تھا۔ اور نہ ہی اس کا بوجھ غلام رسول پر پڑتا تھا۔ بہرکیف بیگم صاحبہ کو بازاری بھاؤ کی نسبت سب چیزیں بارعایت ہی مل جاتی تھیں۔

جس قدر غلام رسول کام میں پھرتیلا تھا۔ اسی قدر باتوں میں سست بھی تھا۔ اسی لئے انوری اور اس کی ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ انوری اسے باتوں میں یوں پچھاڑتی کہ بیچارہ کبھی ایک پاؤں پر، کبھی دوسرے پاؤں پر بھار تول تول کر کھڑا ہوتا۔

پہلے دن جب انوری اس گھر میں بادرچن بن کر آئی تو غلام رسول ریڑھے پر سے سودا سلف اتار رہا تھا۔ گندم کی ڈھائی من کی بوری کندھے پر اٹھائے جب وہ سامنے نکلے، جب غلام رسول گودام کے پاس پہنچا تو انوری نے پوچھا۔

"تو بھی نوکر ہے یہاں۔۔۔"

غلام رسول تھا تو نوکر ہی، لیکن اس گھر میں آج تک کسی نے اسے اس لفظ سے نوازا نہیں تھا۔ اس کی حیثیت منشی اور منیم جیسی تھی۔ وہ تو گنٹھیا کے درد کی مانند اس خاندان کے جسم کا ایک حصہ ہو چکا تھا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے بوری کو کندھے سے پھینک کر بمشکل جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا نام کچھ بھی ہو تجھے کیا؟"

انوری بھی کھی کرکے ہنسنے لگی۔ چپڑ چلاکھ جیسے ہونٹ بڑی خطرناک صورت اختیار کر گئے۔

"ہنستی کیوں ہے؟"

"تو نام کیوں نہیں بتا دیتا دیتا۔ ابھی کوئی آواز دے گا تو بھی تو پتہ چل ہی جائیگا۔"

"غلام رسول ہے میرا نام۔۔" وہ جل کر بولا۔

"غلام رسول؟ اللہ غلام رسول۔"

اب انوری کا قہقہہ پہلے سے بھی زیادہ بلند تھا۔

غلام رسول دو بچوں کا باپ تھا۔ ظہر اور عشا کی نماز مسجد میں پڑھنے کا عادی تھا۔ اسے اس گھر میں نوکری کرتے پورے دس سال ہو گئے تھے۔ اس بیباک لڑکی کے قہقہے تو اسے ڈس ہی گئے۔

"ہنستی کیوں ہے کمبخت!"

انوری منہ میں دوپٹہ ٹھونس ٹھونس کر ہنستی رہی۔ غلام رسول ریڑھے پر سامان لاتا رہا۔ اور چپ چاپ گودام میں رکھتا رہا۔ جب انوری ہنستے ہنستے تھک گئی تو بولی۔

"میرے چاچے کا نام بھی غلام رسول ہے۔"

"اچھا اچھا کام کر۔۔۔ جا۔۔۔"

گھر میں جہاں غلام رسول کو سب بھاجی کہتے تھے صرف انوری ایسی تھی کہ پہلے دن سے اس نے غلام رسول کا نام لیا اور آخری دن تک اسی ضد پر قائم رہی کہ میں تو غلام رسول کا نام لوں گی۔ وہ بھی ملازم ہم بھی ملازم۔

غلام رسول کے بعد باہر کے نوکروں میں ڈیوڈ ڈرائیور بہت معتبر تھا۔ وہ گھر کی جمعدارنی کا بھانجا تھا لیکن اس کے لئے ہمیشہ باہر کرسی جاتی۔ گو اس کے برتن علیحدہ تھے۔ لیکن کھانا اس کا ہمیشہ ٹرے میں لگ کر جاتا۔ پکے رنگ کا خاموش سا لڑکا تھا، وردی پہن کر اس کی شخصیت منسٹر جیسی نکل آتی۔ ڈیوڈ خالو جمال کو دفتر پہنچا کر تنویر بابی کو کالج چھوڑتا پھر فوراً گھر واپس آجاتا۔ ریاض میاں اپنی موٹر سائیکل پر آتے جاتے تھے۔ اس لئے ڈیوڈ کو صرف بیگم صاحبہ کو خوش کرنے کی مشکل تھی۔

صبح کے وقت خالہ فیروزہ عموماً ٹہلنے کرنے نکل جاتی تھیں۔ یہ ان کی زندگی کے بڑے مشغول گھنٹے تھے۔ گھر پر کپڑوں کا انبار ہونے کے باوجود ہر نیا رنگ ہر نیا کپڑا ان کی جان بن جاتا۔ اور اسے چاہے وہ کئی دن نہ خریدتیں پھر بھی ان کی جان پر بنی رہتی۔

بزاز اور درزی کے بعد انہیں جیولرز سے بہت کام رہتے تھے۔ پرانے زیور کی توڑ پھوڑ، نئے زیور کے رتی ماشے تلوانے، موتیوں کو پرکھنے اور جدید زیوروں کو پہن پہن کر آئینے میں دیکھنے کا انہیں بہت شوق تھا۔

خالہ چالیس اور پینتالیس کے درمیان کہیں تھیں۔ یہ عمر کا وہ حصّہ تھا جہاں چہرہ عمر کی غمازی کرنے لگتا ہے۔ لیکن اتفاق سے ابھی تک خالہ کے سارے بال سیاہ تھے۔ ہاتھ اور پاؤں عموماً چہرے کی طرح بے رحم نہیں ہوتے۔ ان پر ابھی عمر کی چھاپ نہ لگی تھی۔ اسی لئے خالہ فیروزہ کو اپنے ہاتھ، پاؤں اور بال بہت پسند تھے۔

ایسی چپلیں جن پر سیموں کے نقاب جیسی جالی مڑھی ہوتی ہے انہیں بہت پسند تھیں کیونکہ ان کا سارا پیر ہر لمحہ سامنے رہتا تھا۔ ان پیروں کو خالہ بڑے اہتمام سے دھویا کرتی تھیں۔ اور پھر خشک کر کے پاؤڈر سے بسایا کرتی تھیں۔ ان پیروں کی نسبتی بسائے رکھنے کی خاطر انہیں بار بار پالش فروشوں کے ہاں چکر لگانے پڑتے۔ ہاتھوں کو بالائی کی طرح نرم رکھنے کے لوشن، اور بالوں کو دھونے کے ان گنت شیمپو ان کے پاس جمع ہو گئے تھے۔۔

دوپہر کو تھوڑی دیر استراحت کرنے کے بعد خالہ عموماً کسی نہ کسی سے ملنے جایا کرتی تھیں، اگر خالو جمال ساتھ ہوتے تو خالو کے دوستوں کے ہاں، ورنہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں مجلس جمتی۔ اپنے بال ہاتھ اور پیر تو خالہ فیروزہ کی توجہ کا باعث تھے ہی لیکن ان کا ایک اور بھی مشغلہ تھا جس کی بدولت ان کی زندگی مزیدار بنی ہوئی تھی۔

شہر بغداد کے ایک بادشاہ کا دستور تھا کہ رات کے پچھلے پہر اپنے وزیر باتدبیر کو جلو میں لے شہر میں گشت کیا کرتا تھا۔ گلی گلی قریہ قریہ کوچہ کوچہ گھومتا اور ان مظلوموں کی دادرسی کرتا جن کی دسترس دن کے وقت شاہ تک نہ ہو سکتی۔

ایک شب کہ تارے خوب نکلے تھے۔ اور فضا میں نارنج کے پھولوں کی مہک اس طرح پھیل رہی تھی جیسے پانی میں شراب کا رنگ۔ شاہ پرجلال نے بھیس بدلا، وزیر کو ساتھ لیا اور گشت کو نکلا۔

ابھی محل سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک حبشی کی صدا آئی۔۔۔ "آہ! اس شہر میں انصاف نہیں، اس شہر کا بادشاہ دیندار نہیں، ہم روتے ہیں وہ بستر کمخواب پر سوتا ہے۔ آہ!۔۔۔ کہ موت بس میں نہیں ورنہ اس شہر کو چھوڑ جاتا۔ اور ادھر مڑ کر کبھی نہ آتا!"

اس بخت سرگشتہ، حالت ناگفتہ، آبنوس صفت حبشی کے پاس شاہ آیا اور وجہ اس آہ و زاری کی پوچھی تو مراکش کا رہنے والا بولا "اے تاجر! تجھ سے اپنی داستان کیا کہوں کہ ایک ماہرو شعلہ جوالہ میری طالب تھی۔ میں بھی ہر وقت اسی کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اسی چھپتی گلی میں کہ جہاں اس پیکر شرم و حیا کا باپ عطار تھا، ایک بدخصلت پراگندہ حال کٹنی بھی کہیں سے آئی اور میری محبوبہ پر اپنی باتوں کا دام پھیلا کر اسے ساتھ لے گئی۔

احوال اس کٹنی کا کیا بیان کروں کہ سواد شہر سے کوئی ڈھائی کوس

وہ اس نے ایک عشرت گاہ بنا رکھی ہے۔ یہاں صبح و شام خوشبو جلتی ہے۔ شراب نہروں میں چھلکتی ہے۔ کنواریاں دودھ میں نہاتی ہیں۔ اور شہد کا کاجل لگاتی ہیں۔ ان کا لباس بے حیائی ہے۔ اور ان کی خوراک عاشقوں جبیں سائی ہے۔ وہ کشتی خود تو ماہ پارہ نہیں لیکن اتنے چاند اس کے گرد گھومتے ہیں کہ ان ماہ پاروں کی ضیا سے اس کا چہرہ کندن سا دمکتا ہے۔ وہ خود تو جوان نہیں لیکن اتنی جوانیاں لیے کندھوں پر اٹھائے پھرتی ہے کہ وہ بہار کے اولیں شگوفے کی مانند نوآموز لگتی ہے، جب یہ کلی جیسا حسن و جوانی کو اپنے میں منعکس کر کے ٹہلتی ہے۔ تو ہر نوگرفتار اسی کا عاشق ہو جاتا ہے۔

اے تاجر ذی ہوش! تجھ سے اس عورت کا کیا ذکر کروں، میں خود اسے دیکھ آیا ہوں، اور اب سوچتا ہوں کہ اس تمکین و ہوش کی دشمن سے اپنی ماہ پارہ کو کیونکر چھڑا لوں؟ اسے دیکھنے کے بعد مجھ میں اسے قتل کرنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ تو ہی بتا کہ میں کیا کروں؟ آہ کہ موت بھی اس شہر سے روٹھ گئی ہے"

شاہ نے اس حبشی غلام کو کیونکر اس کی منظورِ نظر دلائی یہ قصہ دوسرا ہے۔

خالہ فیروزہ کی دوستی شہر کی دلربا مہ پارہ حسیناؤں سے تھی۔ کچھ ایسی افسران بالا حکام کی بیگمات بھی ان کی دمساز تھیں جن کی بیٹیاں سنِ بلوغ کو پہنچ چکی تھیں۔ خالہ کو نوجوان عورتیں اور خاص کر کم گو اور خوش شکل لڑکیاں اس لیے بہت پسند کرتی تھیں کہ خالہ شہر بھر میں سب سے زیادہ جنسی لطیفے جانتی تھیں۔ ان لطیفوں میں کا جو